قرآن کا معاشی رجحان

پروفیسر شیخ محمد عثمان

موضوع کے متعلق اپنی گفتگو سے پہلے دو ایک باتیں تمہید کے طور پر عرض کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں ۔

(۱)

پہلی اور نہایت اہم بات ذہن میں رکھنے کے قابل یہ ہے کہ اسلام کا معاشی یا سیاسی نظام اس کے اعتقادی، اخلاقی یا عباداتی نظام سے اپنی ہیئت میں ایک مختلف چیز ہے ۔ قرآن مجید نے اعتقادی، اخلاقی یا عباداتی نظام کو بہت تفصیل سے اور مکمل حدود اربعہ کے ساتھ بیان کیا ہے، اور اس میں وقت کے ساتھ کسی بڑی اور بنیادی تبدیلی کی گنجائش نہیں رکھی ؛ اس کا اعتقادی، اخلاقی اور عباداتی نظام غیر متغیر اور ابدی جزئیات پر استوار ہے اور وقت کا مرور ان میں رخنے نہیں ڈال سکتا ۔

اس کے برعکس جہاں تک معاشی یا سیاسی نظام کا تعلق ہے، وہ مروجہ معنوں میں شاید نظام، ہیں ہی نہیں، اس لئے کہ قرآن مجید میں ان کی جزئیات یا ان کا مکمل حدود اربعہ بیان نہیں ہوا ۔ معاشی یا سیاسی امور میں قرآن حکیم نے فقط سمت اور آخری مقاصد کا تعین کیا ہے ۔ اگر آپ چاہیں تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں کچھ اصول یا بنیادی احکام دیئے گئے ہیں ۔ تاہم ان کی جزئیات یا فروعات میں جانے سے قرآن نے گریز کیا ہے ۔ اور جدید زمانے کے اَن گنت پیچیدہ معاشی مسائل اور مباحث کے پیش نظر قرآن میں بیان کردہ احکام و اصول کو ہم زیادہ صحت کے ساتھ یوں بیان کر سکتے ہیں کہ قرآن نے ان امور میں ہمیں ایک رویہ، ایک اندازِ نظر اور راہ عمل کے لئے ایک سمت دی ہے ۔ انگریزی زبان میں آپ اسے (Attitude) سے تعبیر کر سکتے ہیں ۔ یہ نظام نہیں ۔ نظام کی روح ہے، منزل نہیں، نشانِ منزل ہے ۔

اب تک کہی ہوئی بات کو قدرے دہراتے ہوئے میں کہوں گا کہ دینِ اسلام نے جہاں خلق کے لئے ہمیں ایک منفرد اور جامع نظامِ اخلاق دیا ہے ۔ اعتقاد کے معاملے میں ایک جامع اور مانع نظام عقائد دیا ہے اور عبادت کے واسطے ایک واضح اور مفصل نظام عبادات دیا ہے، وہاں مملکت کی سیاسی و معاشی تنظیم

کے لئے کوئی جامع اور مانع اور مفصّل اور غیر متغیر سیاسی یا معاشی نظام نہیں دیا بلکہ سیاست کی کارفرمائیوں کے لئے اور معاشرہ میں معاشی امور کو طے کرنے کی غرض سے چند ہدایات دی ہیں جن سے مجموعی طور پہ ان اُمور میں قرآن کا رویّہ (Attitude) ظاہر و مرتب ہوتا ہے۔

اس سے دو نتیجے لازماً اخذ ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلنے والے معاشرتی اُمور کو طے کرتے میں دین نے ہمیں خاصی آزادی اور خود مختاری بخشی ہے۔ قرآنِ حکیم کا اُن معاملات کی تفصیل میں نہ جانے اور بے شمار جزئیات میں کامل سکوت اختیار کرنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ وقت کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق مگر قرآن مجید نے جو سمت اور انتہائی مقاصد متعین کئے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر ہم ہر زمانے میں اپنا نظامِ معاش اور نظامِ سیاست ترتیب دینے کے خود ذمہ دار اور مجاز ہیں۔

دوم، اگر اور جب یہ تفاوت یعنی وہ تفاوت جو از روئے قرآن (مثلاً) معاشی نظام اور اخلاقی نظام میں ہیئت کے اعتبار سے پایا جاتا ہے، نظروں سے اوجھل ہو جائے اور وہ آزادی اور خود مختاری جو کمال حکمت کے ساتھ قرآن نے ہمیں اس ضمن میں دی ہے، سلب کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کے نتیجے میں ذہنی انتشار اور نظری فساد اور دین سے بددلی اور بے یقینی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

اب میں ان ہدایات و احکام کو ایک ایک کر کے مگر مختصراً بیان کرتا ہوں جن سے مجموعی طور پہ اسلام کے معاشی نظام کی روح آشکار اور سمت متعین ہوتی ہے۔

(۲)

طعامِ مسکین:- اگر ترتیبِ نزول کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ابتدائی مکّی سورتوں میں ایک بات بڑی نمایاں نظر آتی ہے اور وہ ہے مسکین کو کھانا کھلانا۔ قرآن حکیم کے الفاظ میں (طعامِ مسکین) کی تلقین عجب سادہ مگر پُر اثر اسلوب میں کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ الماعون کو پڑھئے۔ کل سات نہایت چھوٹی چھوٹی آیات ہیں۔ ان میں سے پہلی تین یہ ہیں:-

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝

"تم نے دیکھا دین کو جھٹلاتا کون ہے؟ وہی جو یتیم کو پرے ہٹاتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔"

گویا منکرِ دین کی ایک بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے اُن افراد سے عملاً کوئی ہمدردی نہیں رکھتا جو اپنی ضروریاتِ زندگی کو خود پوری کرنے سے قاصر یا معذور ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یتیموں کی دیکھ بھال اور غریبوں کی خوراک کا انتظام کرنا دیندار کی بنیادی خصوصیت ہے۔

سورۂ بَلَد میں یہ بتانے کے بعد کہ نیکی کا راستہ دشوار گزار اور مشقّت طلب ہے جن دو نیکیوں کے بیان کو سب پر مقدّم رکھا ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) غلام کو آزاد کرنا۔ اور (۲) کسی بھوکے کو کھانا کھلانا۔ فرمایا:۔

وَمَا أَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۝ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝

"اور آپ جانتے ہیں (راہِ حق کی) گھاٹی کیا ہے؟ (غلام کی) گردن آزاد کرنا یا بھوک کے دن کسی رشتہ دار یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔"

سورۂ اَلفجر میں انسانی زندگی کی ایک گرہ بڑی عمدگی سے کھولی گئی ہے۔ فرمایا، انسان کو جب کبھی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے۔ اور پھر اسے عزت اور نعمت بخشی جاتی ہے تو وہ کہتا ہے "پروردگار نے مجھے عزت بخشی ہے" لیکن اگر وہ یوں آزمائش میں ڈال دیا جائے کہ اس پر رزق تنگ ہو جائے تو وہ بلبلا اُٹھتا ہے۔ اور کہتا ہے "میرے رب نے مجھے ذلیل کرایا" اس موقع پر قرآنِ حکیم نے جو جواب ایسے شخص کو دیا ہے، وہ غور طلب ہے۔ قرآن کہتا ہے ہم نے کیا کیا ہے؟ یہ تو خود تمہارے اپنے کرتوت ہیں۔ تم ہی نے تو یتیم کی عزت نہ کی اور مسکین کو کھانا کھلانے پر توجہ نہ دی (اب ہمیں کیا کہتے ہو!)۔

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝

"(ہم نے ذلیل کیا؟) ہرگز نہیں بلکہ تم ہی یتیم کی عزت نہیں کرتے تھے اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے تھے۔"

اس سورۂ مبارکہ (الفجر) کو غور سے پڑھئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تکریمِ یتیم اور طعامِ مسکین کیسی بنیادی نیکی ہے۔ اور اس پر افراد و اقوام کی فلاح و عدمِ فلاح کا کتنا انحصار ہے۔ یہاں نہایت غیر مبہم لفظوں میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے کہ جو افراد اور معاشرے اپنے یتیموں اور مسکینوں کی معقولیت اور "عزت" کے ساتھ دیکھ بھال کرتے ہیں وہ (خدا کی طرف سے) اس دنیا میں عزت و

نعمت کے حق دار ٹھہرتے ہیں اور جو معاشرے اس بات سے غفلت برتتے ہیں، خدا ان کی معیشت کو تنگ اور خود ان کو ذلیل کر دیتا ہے۔

سورۂ دھر میں نیک افراد کی یوں تعریف کی گئی ہے کہ یہ لوگ مسکینوں، یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اور ان سے شکر گذاری کی توقع نہیں رکھتے:۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ○ (۹-۸ / ۷۶)

"اور وہ مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا اس کی محبت میں کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہم تو اللہ کی خوشنودی کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ ہم تم سے کوئی صلہ نہیں چاہتے اور نہ شکر گذاری"

آیاتِ بالا قریب قریب سبھی اِس دنیا اور اس کے حالات سے متعلق تھیں۔ مگر سورۂ المدثر میں آخرت کے پسِ منظر میں اس حکم کو بیان کیا گیا ہے:۔ اصحابِ جنت گناہگاروں سے پوچھتے ہیں "کس چیز نے تمہیں دوزخ میں لا ڈالا ہے"، مجرمین جواب دیتے ہیں:۔ "ہم نہ تو نماز پڑھتے تھے اور نہ مسکینوں کو کھانا کھلاتے تھے":۔

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ○ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ○

"ہم نہ تو نماز ادا کرتے تھے اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے"

اس موضوع پر قرآنِ حکیم میں متعدد آیات اور ہیں مگر مندرجہ آیات کے مطالعے سے یہ بات آپ پر بخوبی واضح ہو گئی ہو گی کہ 'طعامِ مسکین' اس دنیا اور آخرت کے اعتبار سے کیسی نیکی ہے اور قرآن حکیم نے کس کس طرح اس نیکی کی ہم کو ترغیب و تلقین کی ہے۔

(۳)

حقِ معلوم:۔ زکوٰۃ پر باقاعدہ زور (زیادہ تر مدنی دور میں) دیا گیا ہے لیکن مکی دور کی سورتوں میں ایک اصول اور بیان ہوا ہے جس کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ سورۂ "المعارج" میں ایک جگہ وہ اوصاف و محاسن بہ تفصیل مذکور ہیں جن سے مسلمان کا کردار تشکیل پاتا ہے وہ اپنے معاہدوں کے پابند، امانتوں کے پاسدار، اپنی نمازوں کے محافظ، اپنی جنسی خواہشات کو قابو میں رکھنے والے اور روزِ جزا پر پختہ یقین کے حامل ہیں۔ یہاں نماز کے بعد دوسرے درجے پر اُن کا یہ

وصف بیان ہوا ہے کہ یہ ہیں وہ لوگ جن کے مال و دولت میں سائل اور محروم کا ایک جانا پہچانا 'حق' ہے، الفاظ ملاحظہ ہوں :-

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝

"اور وہ لوگ جن کے اموال میں سائل اور محروم افراد کا ایک جانا پہچانا حق ہے"

طعامِ مسکین اور تکریمِ یتیم کے ضمن میں بات یہاں تک پہنچی تھی کہ نیک دل مسلمان اپنے معاشرہ کے تہی دست اور غریب افراد کی دیکھ بھال کر کے ان پر احسان نہیں دھرتے، یہ نیکی ان کے جذبۂ ایمان اور محبتِ الٰہی کا تقاضا ہے۔ لیکن اس آیت میں بات کو کچھ آگے بڑھایا گیا ہے، جذبۂ ہمدردی اور محبت کی بنا اب 'حق' میں بدل گئی ہے۔ اچھے انسان اور مسلمان وہ ہیں جو اپنی کمائی میں سے سائل اور محروم کا 'حق' جانتے اور تسلیم کرتے ہیں۔

اس 'حق' کی اہمیت کا اندازہ یوں بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بالکل یہی بات سورۃ الذّٰریٰت میں مسلمانوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے دہرائی گئی ہے:-

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝

"اور ان کے مال و دولت میں سائل اور محروم کا حق ہے"

(۴)

زکوٰۃ:- غالباً اسی 'حق' کو آگے چل کر زکوٰۃ کا نام دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کا فریضہ اس قدر اہم اور اس کے متعلق معلومات اتنی عام ہیں کہ اس کو یہاں زیادہ تفصیل سے بیان کرنا شاید غیر ضروری ہوگا۔ تاہم اس ضمن میں دو باتیں مختصراً عرض کی جاتی ہیں:-

اَلحمد سے وَالنّاس تک قرآنِ حکیم میں زکوٰۃ کا حکم اور اس کی تلقین بے شمار جگہوں پر ہوتی ہے اکثر اوقات نماز اور زکوٰۃ کا ذکر اکٹھا ہے اور بیشتر نماز پہلے۔ اور زکوٰۃ اس کے بعد مذکور ہے۔ لیکن دو ایک مقامات پر اس ترتیب کو یوں بھی بدلا گیا ہے کہ زکوٰۃ مقدم اور صلوٰۃ مؤخر الذکر ہوگئی ہے۔

زکوٰۃ کی صورت قریب قریب وہی ہے جو آج تمام ترقی یافتہ ممالک میں (بعض کمیونسٹ ملکوں کو چھوڑ کر) ٹیکس اور سُوپر ٹیکس کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ٹیکس سالانہ آمدنی پر لیا جاتا ہے اور زکوٰۃ محض آمدنی پر نہیں بلکہ جمع شدہ مال پر مع زیورات، زر و جواہر اور دوسری اجناس کے وصول کی جاتی ہے،

جس طرح دوسری قوموں میں ٹیکس اور سُوپر ٹیکس وغیرہ کی شرح اور ان سے متعلق ضابطے وقتاً فوقتاً بدل سکتے ہیں اور بدلتے رہتے ہیں۔ اس طرح زکوٰۃ کی شرح کا بھی حالات اور ضروریات کے مطابق کم یا زیادہ مقرر کیے جانے کا جواز موجود ہے۔ قرآن حکیم نے زکوٰۃ کی جو قطعی شرح مقرر نہیں کی۔ اس کی بھی یہی حکمت سمجھ میں آتی ہے۔

(۵)

صدقات وانفاق: زکوٰۃ کی حیثیت کم وبیش سرکاری ٹیکس کی سی ہے مگر جیسا کہ دوسری قوموں پر ایک نظر ڈالنے سے ثابت ہوتا ہے، اچھے متمول لوگوں میں سرکاری لین دین کے علاوہ بھی اپنی دولت کو رفاہِ عامہ پر خرچ کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اور قرآن حکیم چاہتا ہے کہ یہ جذبہ مسلمانوں میں بدرجۂ اتم موجود ہو۔ امریکہ اور یورپ کے بے شمار دولت مند افراد اسکولوں، کالجوں، شفاخانوں، کتب خانوں، محتاج گھروں اور دوسرے لاتعداد رفاہی کاموں پر لاکھوں، کروڑوں ڈالر اور پونڈ خرچ کرتے ہیں۔ فورڈ فاؤنڈیشن اور راک فیلر فاؤنڈیشن قسم کے رفاہی ادارے تو اپنے ملک کی سرحدوں سے نکل کر غیر ممالک میں بھی اپنے 'انفاق' کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ (یہاں ان اداروں کے سیاسی مقاصد سے بحث نہیں)۔ خود اپنے شہر لاہور میں دیکھیے:۔ یہ دیال سنگھ کالج، دیال سنگھ لائبریری، گنگا رام ہسپتال، رام دیوی شفاخانہ قسم کے ادارے جن سے ہزارہا افراد علم وصحت کے شعبوں میں فیض اُٹھاتے ہیں، کیا ہیں؟ ٹیکس اور زکوٰۃ سے بڑھ کر خرچ کرنے والے فراخ دلوں کے یادگار نقوش!

قرآن حکیم نے صدقات اور انفاق پر بڑا زور دیا ہے۔ کہیں یہ فرمایا ہے کہ جب تک تم اپنا مال وزر جسے تم بہت چاہتے ہو، خدا کے راستے اور رفاہِ عامہ میں خرچ نہ کرو گے تم نیکی کو نہیں پا سکتے، گویا نیکی اور راہِ حق میں دل کھول کر خرچ کرنا لازم وملزوم ہیں۔ کہیں ایسے انفاق اور خرچ کو اللہ کے ذمے 'قرضہ' قرار دیا اور فرمایا: "تم اے مسلمانو! اللہ کو قرض دو، کیونکہ یہ بہت ہی اچھا قرضہ ہے"۔ کہیں مستحق افرادِ معاشرہ خصوصاً رشتہ داروں اور بھائی بندوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ: "تم جو کچھ ان پر خرچ کرو، وہ اعلیٰ نیکیوں میں شمار ہوگا اور ذی استطاعت ہونے پر تم اس سے دریغ نہ کرو" (۲۶۱-۲۷۴/۲)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زکوٰۃ ہی کو دوسرے مقامات اور لفظوں میں صدقہ وانفاق کہا گیا ہے، اور ان کی اپنی الگ کوئی شرعی اصل نہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے میں سورۂ بقرہ کی ۱۷۷ ویں آیت کے متعلقہ حصے کا ترجمہ درج کرتا ہوں، جس سے اندازہ ہوگا کہ قرآن کریم زکوٰۃ سے الگ اس

سلوک' کا غیر مبہم الفاظ میں تقاضا کرتا ہے :۔

"نیکی یہ تو نہیں کہ تم (وقتِ عبادت) مشرق اور مغرب کی سمت منہ پھیر لو۔ نیکی تو اسے حاصل ہوتی ہے جو اللہ، روزِ آخر، فرشتوں، کتابوں اور نبیوں پر ایمان لاتا ہے اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور غلاموں کی آزادی پر اپنا مال خرچ کرتا ہے اور نماز ادا کرتا اور زکوٰۃ ادا کرتا ہے"

آپ نے دیکھا یہاں زکوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر الگ ہے اور رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں پر مال خرچ کرنے کا بیان الگ اور مقدم ہے۔

(۶)

اکتنازِ زر:۔ قرآن مجید نے ایک طرف تو نیکی کے کاموں پر روپیہ خرچ کرنے کی زبردست تلقین کی ہے، اور دوسری طرف ان لوگوں کو خبردار کیا ہے جو روپے پر سانپ بن کر بیٹھتے ہیں یا جمعِ زر کے غیر انسانی جذبے سے مغلوب ہو کر ہر طرف اور ہر طریق سے دولت سمیٹنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس قسم کا انتباہ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ہے۔ یہاں صرف دو آیتیں درج کرتا ہوں۔ سورۂ بقرہ میں ایک جگہ خرچ کا حکم دیتے ہوئے ذی استطاعت ہونے کے باوجود خرچ نہ کرنے کو ھلاکت اور خودکشی سے تعبیر کیا ہے' فرمایا:۔ وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ ۝ (۱۹۵/۲)

"اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو"

اس ضمن میں سورۂ توبہ کی ۳۴ ویں اور ۳۵ ویں آیات حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہیں، جو لوگ دولت کو چھپاتے اور روکے رکھتے ہیں اور نیک کاموں پر خرچ نہیں کرتے، خدا نے ان کو بدترین مجرم قرار دیا ہے، اور انہیں ان کے نہایت خوفناک انجام سے متنبہ فرمایا ہے:

"اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے رہتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، تو ان کو دردناک عذاب کی خبر سنا دے۔ جس دن دوزخ کی آگ میں اُس سونے، چاندی کو تپایا جائے گا، پھر اُس سے ان کے ماتھے اور ان کی کروٹیں اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی (اور ان سے کہا جائے گا) یہ ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، سو اُس کا مزہ چکھو جو تم جمع کرتے تھے"

(۳۴-۳۵/۹)

(۷)

حُرمتِ سود: سود کے متعلق کافی عرصے سے ہمارے ہاں ایک بحث چل رہی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صرف اس روپے پر منافع لینا حرام ہے جسے کوئی ضرورت مند لے کر اپنی ضرورت پر خرچ کر ڈالے اور اگر کوئی شخص ادھر اُدھر سے روپیہ اکٹھا کر کے کسی نفع بخش تجارت یا صنعت میں لگاتا ہے تو روپیہ دینے والے بھی اس کے منافع میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ سود کی ہر صورت اور شکل از روئے قرآن حرام ہے۔ یہاں میں اس بحث میں پڑے بغیر اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں، کہ سود خوری کی جس قدر مذمت قرآن حکیم میں ہے اور سود خور کو حق تعالیٰ نے جس طرح للکارا ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسلام ساہوکارہ کے نظام کا سخت ترین دشمن ہے خواہ وہ نظام افراد کے درمیان ہو یا اقوام کے مابین۔ بغیر تجارت یا محنت کئے محض روپیہ دے کر اُس کا ڈیوڑھا، دُگنا، تگنا وصول کرنے کو قرآن نے ظلم عظیم قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا مگر اب تم اس راہ سے باز آجاؤ، جن کے ذمے قرض ہے، اُن سے نرمی کا برتاؤ کرو یا معاف کر دو یا آسان قسطوں میں اپنی اصل رقم واپس لے لو اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے اُن کو خبردار کیا ہے کہ وہ خدا اور رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جائیں، شاید ہی کسی اور معاشرتی جرم پر اللہ تعالیٰ نے مجرموں کو یوں للکارا ہو اور ان کو دعوتِ مبارزت دی ہو۔ سود کو حرام قرار دینے کے بعد فرمایا:-

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۝ (۲۷۹/۲)

" اور اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ "

سود کی قطعی حرمت اپنے آخری تجزیئے میں معاشی ظلم و استحصال کی روک تھام اور معاشرتی انصاف کی بحالی و قیام ہے۔ سود ظلم ہے اور حرمتِ سود اس ظلم کی بیخ کنی۔

(۸)

گردشِ زر کا زرّیں اصول: اب دو ہدایات بیان کرنے باقی رہ گئے ہیں۔ ایک کا تعلق معاشیات کے اُس اہم نظریئے سے ہے جس کی رُو سے بیشتر ماہرین یہ خیال کرتے ہیں کہ دولت کو قوم کے ہر طبقے میں گردش کرنا چاہیئے۔ اس سے مجموعی قومی سرمائے میں اضافہ ہوتا ہے اور ہر کسی کی ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر دولت چند ہاتھوں میں کسی ایک

طبقے میں گھومتی رہے تو مجموعی قومی سرمایہ میں امکانی ترقی نہیں ہوتی اور قوم کے بعض طبقے اپنی ضروریات سے محروم رہ جاتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے قریب قریب وہی الفاظ استعمال کئے ہیں جو بعض جدید معاشیئن نے اس قانون یا اصولِ معاش کو بیان کرتے ہوئے استعمال کئے ہیں۔

رسولِ اکرمؐ کا دستور تھا کہ غزوات کے بعد مالِ غنیمت کو مجاہدین میں برابر تقسیم فرمادیا کرتے تھے۔ اس سے چند سالوں میں ایک طبقے کے پاس دولت جمع ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہوا تو حق تعالیٰ نے فے یعنی اُس مال کی تقسیم کا جو عہدِ رسالت میں مسلمانوں کو بن لڑے دشمنوں سے ہاتھ آجاتا تھا۔ ایک نیا ضابطہ مقرر کیا۔ فرمایا:۔

"جو مال اہلِ دیہات سے اللہ نے اپنے رسول کو بغیر لڑائی کے دلایا ہے، وہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔"

اور اس حکم کی حکمت یوں بیان فرمائی:۔

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ۝ (۵۹/۷)

یعنی اس قسم کے مالِ غنیم میں یتیموں، مسکینوں اور مسافروں وغیرہ کو (جو ظاہر ہے جہاد و قتال میں شریک نہ ہوتے تھے) اس لئے شریک کیا جا رہا ہے۔

"تاکہ دولت تم میں سے امیروں ہی کے درمیان نہ گھومتی رہے" (سورۂ حشر: ۷)

(۹)

اَلعفو: اب آخری ہدایت کی طرف آیئے۔ اَلعفو کے معنی ہیں، جو کچھ ضروریات سے زائد ہو۔ قرآنِ حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ اور دیگر اہلِ عرب اپنی تسلی اور حصولِ علم کی خاطر رسولِ اکرمؐ سے کئی قسم کے سوالات پوچھا کرتے تھے۔ ان ہی میں سے ایک اہم استفسار جس کا ذکر ایک سے زیادہ بار ہوا ہے یہ ہے کہ "ہم کتنا خرچ کریں؟" سورۂ بقرہ کی ۲۱۵ سے ۲۲۲ تک کی آیات بیشتر ان ہی سوالوں کا جواب ہیں۔ ان میں سے پہلی آیہ مبارکہ یوں ہے (ترجمہ)

"آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دیں: والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر جو بھی تم خرچ کر سکو۔"

یہ ۲۱۵ویں آیت ہے، ۲۱۸ویں آیت میں پھر اس سوال کو دُہرایا گیا ہے۔ مگر اب کے جواب پہلے سے نسبتاً بڑے مطالبے پر مشتمل ہے۔ فرمایا۔ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۝ قُلِ الْعَفْوَ ۝ (ترجمہ)

"آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دیں: اپنی ضروریات سے جو کچھ بچ رہے۔"

(۱۰)

یہ ہیں وہ معاشی ضابطے جن پر قرآن حکیم نے زور دیا ہے۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ اس تمام حکم وتلقین اور منع و انتباہ کو نظر میں رکھتے ہوئے معاشی مسائل کے بارے میں جو تصویر قرآنی تعلیمات کی ابھرتی ہے، کیا وہ واضح اور غیر مبہم طور پر اس تصور سے ملتی جلتی نہیں ہے، جسے عرفِ عام میں جمہوری اشتراکیت یا اشتراکی جمہوریت کہتے ہیں۔ معاشرے کے مفلوک الحال لوگوں کی اخلاقی اور نفسیاتی سطح پہ مناسب دیکھ بھال، کمائے ہوئے اور جمع شدہ مال کا ایک حصہ خزانۂ عامرہ میں دینے کا اٹل حکم، سرکاری ٹیکس کے علاوہ دل کھول کر رفاہِ عامہ پر خرچ کرنے کی تلقین و ترغیب، سود کی سختی سے ممانعت، جمع زر کے رجحان کی شدید مخالفت، روپے کا سارے معاشرے میں پیہم محوِ گردش رہنے پر زور، اپنی ضروریات سے زائد کو راہِ حق میں خرچ کر ڈالنے کی تحریک۔ یہ سب باتیں اس امر پر قطعی دلالت کرتی ہیں کہ اسلام گہرے اشتراکی رجحانات رکھتا ہے، یہ درست ہے کہ تنہا 'العفو' پر زور دینا اور اس ایک پہلو کو اسلامی معاشرے کی معاشی اساس قرار دینا راہِ اعتدال سے ہٹ جانے کے مترادف ہوگا لیکن 'العفو' کے علاوہ جو احکام و اصول قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں، ذرا آپ سوچیے، کہ ان کا الگ الگ اور مجموعی رجحان اور زور کس طرف ہے۔

اور پھر یہ بھی سوچیے کہ آزادی کے بعد سے جو معاشی قوتیں ہمارے ہاں برسرِ کار آئی ہیں اور آ رہی ہیں ان کا رجحان اور زور کس طرف ہے؟۔ ۱۹۶۳ء کے اوائل میں سٹیٹ بینک اور صنعت کاری میں امداد دینے والے سرکاری اداروں کی کارگذاری کا جائزہ لینے والے کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی تھی اور اس پر اخبارات کے تبصرے بھی۔ ان کا حاصل یہ تھا کہ ملک کی بیشتر دولت تین ساڑھے سو گھرانوں اور مل مالکوں کے ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ متذکرہ رپورٹ نے ہمیں بتایا کہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۲ء تک سرکاری اداروں کی طرف سے جو قرضے دیئے گئے، ان کا تقریباً ۶۰ فی صد صرف ۲۲۳ کھاتوں میں گیا۔ اور یہ قرضے دس لاکھ سے پچاس لاکھ تک کے تھے۔ اس کے مقابلہ میں تقریباً ۲۰ ہزار چھوٹے صنعت کاروں کے حصے میں کل قرضہ کا صرف ۹ فی صد آیا۔ اور ان میں سے کوئی قرضہ پچیس ہزار سے زیادہ کا نہ تھا۔ اس صورتِ حالات پہ تبصرہ کرتے ہوئے 'پاکستان ٹائمز' نے اپنی اشاعت مورخہ ۷ جنوری ۱۹۶۳ء کے اداریہ میں لکھا۔

"ان حالات میں اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ چھوٹے اور کم وسیلہ تاجروں اور صنعت کاروں کو

ہر طرح کی مشکلات کا سامنا ہے اور بڑے اور زیادہ وسیلوں والے کارخانہ دار پھولے ہوئے کڑمے کی طرح دن رات ترقی کر رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں، دولت و اقتدار کی ہوس نے اب انہیں ایک نئی راہ سجھائی ہے، وہ ٹرسٹوں، کارٹلوں اور اجارہ داریوں کی تنظیم میں ایک دوسرے کے شریکِ تعاون ہو رہے ہیں تاکہ بازار اور بھاؤ مکمل طور سے ان کے اختیار میں ہو۔ ظاہر ہے کہ اس بڑھتے ہوئے رجحان کو روکنے کی مناسب تدبیر نہ کی گئی تو گنتی کے چند گھرانے ملک کی دولت کا غالب حصہ ہتھیا لیں گے اور ملک کی معاشیات پر عملاً ان کا قبضہ ہو جائے گا۔"

۱۹۶۳ء سے اب تک حالات کچھ زیادہ نہیں بدلے۔ میرا مطلب ہے کہ دولت کے سمٹنے کا رجحان کم نہیں ہوا۔ البتہ حال ہی میں حکومت نے جو "اِن ویسٹ منٹ کارپوریشن" بنائی ہے، توقع کرنی چاہیے کہ اس کی بدولت اس رجحان کو مزید بڑھنے سے روکنا ممکن ہو گا۔

(۱۱)

مضمون ختم کرنے سے پہلے اس موضوع کے تعلق میں پیدا ہونے والے دو تین اہم سوالوں سے نمٹنا بھی ضروری خیال کرتا ہوں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ جب قرآن انفرادی اور نجی ملکیت کا حامی ہے تو کیا اس سے لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ذرائع دولت کو قومی ملکیت میں لینے کا مخالف ہے؟ میرا جواب نفی میں ہے۔ دلیل یہ ہے کہ جب قرآن نازل ہوا۔ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اسلامی معاشرہ کی تشکیل فرمائی۔ اُس وقت انفرادی ملکیت اور قومی ملکیت کا وہ تنازعہ ہی پیدا نہ ہوا تھا جو اب تقریباً تمام ترقی پذیر ملکوں میں بالخصوص اور ساری دنیا میں بالعموم معاشی تنظیم کا نہایت اہم مسئلہ ہے۔ یہ بات اصول کے طور پر ہمیں خوب اچھی سمجھ لینی چاہیے کہ ایسے وہ تمام تمدنی اور معاشرتی مسائل جو خالصتاً جدید دور کی پیداوار ہیں۔ ان کے بارے میں نظری اور عملی فیصلے خود ہماری صواب دید کا مسئلہ ہیں۔ یہاں قرآنی تعلیمات کی روح فقط ہماری رہنما ہونی چاہیے، اس کے علاوہ فقہ و روایات کا کوئی طے شدہ اصول یا بزرگانِ سلف کا کوئی مخصوص طرزِ عمل ہمارے لئے حجت نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ایسا ہر طے شدہ اصول یا طرزِ عمل ان بزرگوں نے قرآن کی روح کو سامنے رکھ کر اپنے مخصوص ماحول اور اپنے مخصوص مسائل کو حل کرنے کی خاطر اختیار کیا تھا۔ لہٰذا اپنے مخصوص ماحول اور اپنے مخصوص مسائل کو حل کرنے کے لئے ہم ان کے فیصلوں یا اصولوں کے پابند کیوں کر ہو سکتے ہیں، ہم تو

صرف اُس تکنیک سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جسے خود ہمارے بزرگوں نے اپنے زمانے میں برتا۔ اور وہ تکنیک یہ ہے کہ کہ قرآن کی روح کے پیشِ نظر ہر دَور میں اُس کے مسائل اس کے اپنے تقاضوں اور ضرورتوں اور انسانی شعور اور قومی امنگوں کے مطابق حل کئے جائیں۔

ذاتی ملکیت کا اصول اپنی جگہ پر، مگر اُس کو کس حد تک محدود کرنا ہے اور جدید دور کے لاتعداد ذرائعِ دولت کو کب کہاں تک اور کیسے قومی ملکیت میں رکھنا یا لینا ہے۔ اس کا فیصلہ خود ہمیں کرنا ہے۔ ہم بہ حیثیت مسلمان جو بھی فیصلہ کریں گے ہمارے دَور میں وہ اسلامی فیصلہ ہوگا۔ جس کو بعد میں آنے والی نسلیں اِسی تکنیک کے مطابق جب اور جیسا چاہیں بدلنے کی مجاز ہوں گی اور ان کے زمانے میں ان کے فیصلے بھی اسلامی ہوں گے خواہ وہ ہم سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔

اس ضمن میں میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جدید دَور کے مسلمان ملکوں اور معاشروں کو انفرادی ملکیت کا ادارہ ضرور زندہ و برقرار رکھنا چاہیئے لیکن اسے اس طرح اور اس حد تک محدود کر دینا چاہیئے کہ وہ قومی ترقی اور عوام کی خوش حالی اور بہتر معیارِ زندگی میں حائل نہ ہو۔ مثال کے طور پر آج کل تمام عالمِ اسلام میں مکانوں کی قلّت کا مسئلہ درپیش ہے۔ بےشمار لوگ بے گھر ہیں اور چند لوگوں کے پاس بڑے بڑے محل، وسیع و عریض کوٹھیاں اور درجنوں مکان ہیں جن سے زیادہ سے زیادہ کرایہ حاصل کرنے کا رجحان عام ہے اس سے یہ ثابت ہوا کہ ذاتی مکان یا رہائشی جائداد کا ادارہ اپنی معصوم اور فلاحی سرحدوں کو پھلانگ کر ظلم و جور اور استحصال و معصیت کی راہ میں بہت آگے نکل گیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی اسلامی ملک اس قسم کا قانون نافذ کردے کہ کوئی گھرانہ ایک سے زیادہ مکان کا مالک نہیں رہ سکتا تو اس دَور میں یہ عین اسلامی قانون ہوگا۔

یہی صورت زمین کی ملکیت کی ہے۔ اسلامی معاشرہ میں کسی فرد یا گھرانے کی اپنی زمین، مالکانہ حقوق کے ساتھ ہو سکتی ہے لیکن حدِ ملکیت مقرر کرنے کا اختیار پھر حکومت یا معاشرے یا دوسرے لفظوں میں جمہور مسلمانوں کے پاس محفوظ ہے۔ اگر کسی اسلامی ملک میں زمین وافر اور آبادی کم ہے یا مزارعین کا طبقہ مقابلتاً کمتر تعداد میں ہے تو فی کس یا فی گھرانہ حدِ ملکیت زیادہ ہو سکتی ہے اگر صورت اس سے برعکس ہو تو حدِ ملکیت کم یا کم سے کم ہونا چاہیئے۔ مثال کے طور ہمارے ہاں چند سال پہلے تک زمین کی ملکیت کا مسئلہ جدید معاشی اصلاحات کی ذیل میں نہیں آیا تھا۔ اگرچہ ملک کا ایک طبقہ اس کا شدید احساس رکھتا تھا اور اس نے زرعی اصلاحات کا ڈول بھی ڈالا تھا۔ مگر اس کو قانونی صورت صدر ایوب کے دَور میں حاصل ہوئی۔ صدر ایوب نے جو زرعی اصلاحات نافذ کی ہیں۔ اس میں حدِ ملکیت پانچ سو ایکڑ ہے۔ بعض لوگ اس حد کو زیادہ یا بہت زیادہ خیال کرتے ہیں،

ابھی چند روز پہلے (۲۰ فروری ۶۶ء) کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ مغربی پاکستان کسان کمیٹی کے ارکان نے اپنی ایک قرارداد کے ذریعے مطالبہ کیا ہے کہ حدِ ملکیت پانچ سو ایکڑ سے گھٹا کر ایک سو ایکڑ کر دی جائے۔

غرض یہ اور اس قسم کے دوسرے تمام سوالات آج ہمیں خود حل کرنا ہیں۔ ان معاملات میں زمانۂ سلف کی مثالیں اور نظیریں اور دلیلیں پیش کر کے نئے اقدامات کو خلافِ اسلام ثابت کرنا درست طرزِ عمل نہیں، قرآن کی روح عدل و انصاف، ترقی و ارتقا اور عوامی فلاح و بہبود کا مسلسل تقاضا کرتی ہے۔ اب اگر یہ روح زمینداریوں کے خاتمے یا حدِ ملکیت کے لیے ۱۰۰ ایکڑ یا ۵۰ ایکڑ یا پچیس ایکڑ کا تقاضا کرتی ہے اور انسانی شعور، عوامی احساسات اور مسلمان دانش وروں کی بصیرت اس کی تائید کرتی ہے تو ہمارے دَور میں یہی اسلامی معاشی نظام قرار پائے گا۔

(۱۲)

دوسرا سوال یہ ہے کہ اسلام کے معاشی ضوابط کی روح کو یعنی عدل و انصاف اور حسنِ اعتدال کے جدید تقاضوں کو اسلامی مملکتوں میں کیوں کر جاری و نافذ کیا جا سکتا ہے؟ زیادہ واضح لفظوں میں یہ سوال یوں ہے کہ کیا مطلوبہ معاشی اصلاحات پُرامن ذرائع یعنی تلقین و ترغیب اور جمہوری انداز میں رائے عامہ ہموار کر کے حاصل کی جائیں یا انقلابی ذرائع کو بروئے کار لا کر؟ قرآن پُرامن ذرائع کو اور تعلیم و تربیت اور تبلیغ و اشاعت کے وسیلوں کو ترجیح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان وسائل کو پورے خلوص، صبر، حسنِ تدبر اور مستقل مزاجی کے ساتھ کام میں لایا جائے۔ رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مکی زندگی اس امر کی شاہدِ عادل ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ پر حقیقت ہے کہ قرآن حد درجہ صلح و آشتی اور امن و سلامتی کا پیغام بر ہونے کے باوجود جب دیکھتا ہے کہ پانی سر سے گذر رہا ہے اور ظلم و زیادتی کی قوتیں امن و آشتی کی زبان سمجھنے سے انکاری ہیں تو وہ طاقت اور قوت کے استعمال کو خارج از جواز نہیں سمجھتا۔ قوت سے پہلے ترغیب و اشاعت کا طویل اور صبر آزما دَور قرآن کی تعلیم اور اسوۂ رسولؐ ہے۔ لیکن جب اور جہاں ترغیب و اشاعت کے تمام ذرائع ناکام ہو جائیں تو قرآن کا فیصلہ فتنے کو رد کرنے کے لئے قتل کے حق میں ہے (اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۵) رسولِ اکرمؐ کی مدنی زندگی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا طرزِ عمل جب انہوں نے اُن مسلمان قبائل کے خلاف قوت استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جو زکوٰۃ ادا نہ کرنے اور انصاف کے تقاضوں سے روگردانی پر اڑے بیٹھے تھے۔ اس ضمن میں مؤثر اور وافی دلیل مہیا کرتے ہیں۔

(۱۳)

مضمون کے آخری پیراگراف میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ہمارا دَور ایسا ہے کہ اس میں معاشی ناہمواریاں

اور بے اعتدالیاں بہت دیر تک اپنی گرفت مضبوط نہیں رکھ سکتیں۔ انسانی شعور روز بروز حساس اور تیز تر ہوتا جارہا ہے۔ اُدھر چین اور روس جیسے ملکوں کے نظری اور عملی اثرات دور دور تک پھیلتے جارہے ہیں۔ ایسے میں جس ملک کے دانش ور اور اہل سیاست خود اپنے ہاتھوں سے اپنی معاشی عمارت کی درستی نہیں کریں گے۔ ان کے لئے یہ کام وقت کا بہاؤ اور تاریخ کی قوتیں انجام دیں گی۔ اور اگر پاکستان کے اندر یہ کام وقت کے بہاؤ اور تاریخ کی قوتوں پر چھوڑ دیا گیا اور خود ہم نے اس عظیم ترین فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی تو اس کے نتیجے میں اسلام اور وہ نظریہ جس کے زور پر پاکستان حاصل ہوا ہے، خطرہ میں پڑ جائے گا۔ لہٰذا دیانت اور دانش مندی دونوں کا تقاضا ہے کہ اپنے ہاں کی معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کا بندوبست ہم خود کریں۔ اور اسلام کی مدد اور اسلام کے نام پر کریں تاکہ نظریۂ پاکستان اور ہماری قومیّت کی بنا مضبوط ہو اور مخالف قوتوں کو سر اُٹھانے اور ہمارے عظیم مقاصد کو نقصان پہنچانے کا موقع ہاتھ نہ آئے۔ ✤

شاید ۱۹۴۴ عیسوی کا ذکر ہے، حیدر آباد سندھ میں جمعیت العلماً کا اجلاس تھا۔ اس میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کا ایک مضمون مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی نے پڑھا تھا، جس کا موضوع زکوٰۃ تھا۔

مولانا سندھیؒ کے اس مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ زکوٰۃ مکہ مکرّمہ ہی میں فرض ہو گئی تھی، لیکن اس کی شرح معین نہ تھی، اس میں حکمت یہ تھی کہ مکہ مکرّمہ میں بیت المال نہیں تھا، جس سے کہ مسلمانوں کی عام ضرورتیں پوری کی جاتیں، چنانچہ حسبِ ضرورت زکوٰۃ نکالی جاتی تھی، لیکن جب مدینہ منورہ میں بیت المال قائم ہو گیا تو زکوٰۃ کی معین شرح مقرر کر دی گئی، اور یہ اُس وقت کی ضروریات کے لئے کافی تھی، بے شک زکوٰۃ کی یہ شرح مسنون ہے. یعنی اس سے یہ کم نہیں ہو سکتی. لیکن یہ کہ ضرورت کے وقت اس میں اضافہ نہیں ہو سکتا. صحیح نہیں۔ (ضیاً)